سید سلیمان ندوی: ایک رجحان ساز سیرت نگار

نگار سجاد ظہیر*

ہندوستان، تحریک استشراق کا راست ہدف:

عہد جدید یعنی انیسویں اور بیسویں صدی کے حوالے سے عالمِ اسلام کا سیاسی منظر نامہ یہ ترتیب پاتا ہے کہ یورپی استعماریت کے نتیجے میں مسلمانوں کے سیاسی زوال کا عمل مکمل ہو چکا تھا اور ہر شعبۂ زندگی میں ایک عام جمود وانحطاط طاری تھا۔ مغربی استعماریت ایک طرف اسلامی حکومتوں کو ختم کر رہی تھی، دوسری طرف ان کے علوم و فنون، سائنسی ترقی اور نظر فریب تہذیب، مسلمانوں کے مذہب واخلاق اور تہذیب وتمدن کے قلعوں کو مسمار کر رہے تھے۔ اور مسلمان یورپ کی سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ اس کی ذہنی غلامی میں بھی مبتلا ہوتے جا رہے تھے، جو سیاسی غلامی سے بھی زیادہ سخت تھی۔(۱) یہی حال ہندوستان کے مسلمانوں کا بھی تھا۔ خصوصاً ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد وہ اور بھی پست و پامال ہو کر رہ گئے تھے۔ ہندوستان جب برطانوی نو آبادی بن گیا تو اس استشراقی تحریک (۲) کا براہِ راست ہدف بنا جو سولہویں صدی سے قدرے منظم انداز میں آگے بڑھ رہی تھی۔

غالباً یہ کہنا درست ہوگا کہ تحریک استشراق ابتداً خلافِ اسلام ایک سرگرمی تھی جس کا آغاز ظہور اسلام کے ساتھ ہی ہو گیا تھا، جب مسلمانوں نے ربع صدی کے اندر اندر جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر ساسانی اور بازنطینی ریاستوں کو مغلوب کر لیا جس سے یہودیت اور عیسائیت کو بھی زک پہنچی لہٰذا ان مفتوحہ اقوام کا ایک گروہ اسلام دشمنی پر کمربستہ ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر یہود و نصاریٰ کی مخالفت کے بعد ہی آٹھویں صدی عیسوی سے ،کلیسا کے پروردہ علماء کی طرف سے اسلام اور رسول اللہ کے خلاف معاندانہ رویہ کا آغاز ہوا۔(۳)

اس کے بعد یہ سلسلہ چل پڑا مغربی دنیا کے متعدد عیسائی اور یہودی علماء نے قرآن، اسلام اور رسول اللہ کی ذاتِ گرامی کو کئی صدیوں تک موضوع بنائے رکھا اور اس حوالے سے نہایت افسوس ناک، شرانگیز اور منفی لٹریچر سامنے آیا۔ یہ سلسلہ صلیبی جنگوں کے آغاز یعنی گیارہویں صدی عیسوی کے اواخر تک قائم رہا۔ یہ صلیبی جنگیں ۱۰۹۹ء تا ۱۴۶۴ء جاری رہیں (۴)، جس میں دنیائے اسلام کے خلاف یورپ کی متحدہ فوجوں نے صف آرائی کی تاہم ان

* پروفیسر، شعبہ اسلامی تاریخ، کراچی یونیورسٹی، کراچی، پاکستان

صلیبی جنگوں کے نتائج اربابِ کلیسا کے حق میں اچھے نہ نکلے۔عسکری میدانوں میں ہونے والی اس ہزیمت کا بدلہ یورپ نے فکری اور علمی محاذوں پر لینے کا فیصلہ کیا، یہی فیصلہ بالاخر تحریکِ استشراق کی شکل میں سامنے آیا۔محمد اسد کی یہ رائے نہایت صائب معلوم ہوتی ہے کہ ''استشراق کا تانابانا صلیبی جنگوں کے دور میں تیار ہوا۔صلیبی جنگوں کے دوران اور ان کے بعد یورپ میں ایک ایسا ادب وجود میں آنا شروع ہوا جس میں اسلام دشمنی کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔''(۵)

ان محاربات صلیبی کے نتیجے میں اربابِ کلیسا اسلام کے خلاف نظریاتی محاذ پر ڈٹ گئے۔اس نظریاتی محاذ پر بہترین نتائج حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ ایک طرف تو وہ مشرقی زبانوں خصوصاً عربی سے واقفیت حاصل کریں، دوسری طرف علوم اسلامی ،قرآن اور سیرتِ رسول اللہ کا اتنا گہرا مطالعہ کریں کہ کمزور پہلوؤں کی دریافت آسان ہو سکے، بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے وہ ایسا علم الکلام اور فلسفہ وجود میں لائیں جوایک طرف تو اسلامی تعلیمات کے ازالہ کے لیے مناسب دلائل فراہم کر سکے تو دوسری طرف عالمِ اسلام کو متاثر بھی کر سکے۔پھر اس لٹریچر کو جدید اصولِ نقد اور تحقیقی منہج (methodology) پر پیش کیا جائے، تا کہ سائنسی بنیادوں پر اس کا جواب فراہم کرنا مسلمانوں کے لیئے امر دشوار ہوجائے جو پہلے ہی علمی طور پر مردہ ہیں۔اس طور سے مغرب کا یہ معاندانہ رویہ،تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔

یہ مقاصد سولہویں صدی تک متعین ہو چکے تھے اس متعین مقاصد کے حصول کے لئے مستشرقین کا جو گروہ سامنے آیا وہ کلیسا کا پروردہ تھا، گویا اس تحریک کی شروعات خالص مسیحی مشنری اور کلیسائی پس منظر میں ہوئی (۶) انتہائی اختصار کے ساتھ اس استشراقی تحریک کا جائزہ اگر لیا جائے تو صورتِ حال یہ بنتی ہے کہ گیام پوسٹل (۷) (Postel Guillaume ۱۵۱۰ء-۱۵۸۱ء) کو مستشرقین یورپ کا باوا آدم سمجھا جاتا ہے، وہ پہلا اصولی مستشرق تھا جس نے تحریک استشراق کو منظم کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔اس کے بعد اس کے شاگردوں نے اس کام کو آگے بڑھایا۔ ۱۵۸۶ء میں عربی مطبوعات کا سلسلہ یورپ میں شروع ہوا (۸) اس کی بدولت بے شمار عربی کتب مستشر قین کے ہاتھوں میں پہنچیں۔سولہویں صدی میں ہی لائیڈن میں بھی عربی شعبہ کا قیام عمل میں آچکا تھا۔

سترھویں صدی اور اٹھارویں صدی، یورپی استعماریت کی صدیاں ہیں، مشرقی ممالک میں یورپ کے جمتے ہوئے قدم نے تحریکِ استشراق کو بھی مہمیز دی تاہم اٹھارویں صدی میں مستشرقین کے رویہ میں فرق ضرور نظر آتا ہے اور اس فرق کی اہم وجہ ان کے ماخذ (sources) کی تبدیلی تھی اس سے قبل مستشرقین اپنے روائتی مواد پر بھروسہ کرتے تھے لیکن اب عربی زبان سے واقفیت اور یورپ میں عربی کتابوں کی اشاعت نے انہیں حقائق سے قریب تر کیا۔

اٹھارویں صدی میں مغربی مصنفین اور دانشوروں میں ''مطالعۂ مشرق'' کا ذوق اور زیادہ نظر آتا ہے۔ان میں سے بعض کا (۹) رویہ اسلام، پیغمبر اسلام، اور اسلامی تاریخ کے حوالے سے سابقہ متشددانہ اور متعصبانہ رویہ کے مقابلے میں معقولیت اور انصاف پسندی کا رویہ تھا۔مزید براں یہ صدی یورپی استعماریت کی بھی صدی تھی، یورپ کی سیاسی قوت مشرق کے اسلامی ممالک میں پھیلنی شروع ہوئی تو مشرق سے روابط استوار کرنے کے سیاسی مفاد نے ،جس سے ان کے بیش بہا معاشی مفادات بھی وابستہ تھے،''مطالعۂ مشرق'' کو ان کی ضرورت بنا دیا، لہٰذا انہوں نے مشرق میں اپنے زیر استعمار ممالک میں بھی اور مغرب میں بھی السنۂ شرقیہ کے مدارس کھولے، ایشیاٹک سوسائیٹیاں قائم کیں (۱۰) اور ان کے تحت تحقیقی جرائد (Research Journals) نکالے جانے لگے، ۱۷۹۵ء میں فرانس نے مشرق کی زندہ زبانوں یعنی عربی، فارسی اور ترکی کا دارالعلوم قائم کیا بعدازاں اسی کی تقلید میں تمام ممالک یورپ میں اس قسم کی اور انجمنیں قائم ہوگئیں۔تمام جامعات میں عربی زبانوں میں اساتذہ اور کتب خانوں کا وجود لازمی سمجھا جانے لگا۔مسلمانوں کے پاس عربی زبان میں سیرت اور مغازی کی جو کتابیں محفوظ تھیں وہ ایک ایک کر کے با استثنائے چند، اٹھارویں صدی کے اواخر سے لے کر انیسویں صدی کے اختتام تک یورپ میں چھپ گئیں اور ان میں اکثر کا یورپی زبانوں میں ترجمہ بھی ہوگیا (۱۱) شبلی کہتے ہیں:'' اُن اصل تاریخی تصنیفات اور ان کے تراجم کی اشاعت ممالک اسلامیہ اور یورپ کے تعلقات، مذہبی منافرت کی کمی اور آزادانہ تحقیقات کی خواہش ان تمام چیزوں نے یورپ میں مصنفین تاریخ اسلام اور سوانح نگارانِ پیغمبر عرب کا ایک کثیر التعداد گروہ پیدا کر دیا۔''(۱۲)

اس صورتِ حال کی وجہ سے مستشرقین میں سیرت نگاری کے حوالے سے ایک نئے رجحان کو تقویت ملی، یہ نیا رجحان رسول اللہ کی سیرت کا زیادہ معقول، مستند اور منصفانہ مطالعہ تھا اور فلپ۔کے۔حتی کا یہ بیان درست معلوم ہوتا ہے کہ '' کارلائل (carlyle) (۱۳) کا محمد کو پیغمبرانہ ہیرو کے کردار کے لیئے منتخب کرنا بیک وقت نئے رجحان کی طرف اشارہ بھی تھا اور اس رُجحان میں اضافہ کا باعث بھی۔''(۱۴)

محمد حسین ہیکل نے اپنی ''حیاۃ محمد'' کے مقدمے میں اُنیسویں صدی کے ایسے تمام مورخین کا ذکر کیا ہے اور ان کی تحریروں کے نمونے درج کیے ہیں (۱۵) انیسویں صدی کے آغاز سے لے کر بیسویں صدی کا رُبع اول تحریکِ استشراق کا دورِ عروج ہے۔یہ مسلمانوں کے سیاسی، علمی وفکری زوال کا اور مغرب کے عروج کا دور ہے۔اس دور میں مستشرقین کی ایک بڑی تعداد سامنے آئی انہوں نے تصنیف وتالیف کے ڈھیر لگا دیئے۔ان کے مطالعہ اور تحقیق کا دائرہ بھی وسیع ہوگیا اور انہوں نے عقائد اسلام، قرآن، حدیث، سنت، فقہ، اجتہاد، اسلامی تہذیب وتمدن، اسلامی تاریخ، عربی زبان ولغت وادب، عرب واہل عرب اور رسول اللہ اور ان کے اصحاب کی سیرت وسوانح پر کثرت سے

لکھا۔ اس دور میں مستشرقین کا معیار تحقیق و استدلال بھی بلند ہوا۔ قدیم عربی ماخذ کی تلاش، مخطوطات اور قلمی نسخوں کی دریافت، آثار و اکتشافاتِ قدیم کا مطالعہ، کتابوں کی تصحیح و اشاعت، اسلامی تاریخی ماخذ کی ترتیب و تدوین، فہرستوں اور اشاریوں کی تیاری، ان کے حیرت انگیز کام ہیں جن کا اعتراف کیا جانا چاہیے۔ تاہم ان مستشرقین میں حسبِ سابق دونوں طرح کے افراد شامل تھے۔ ایک طرف کلیسا کے پروردہ روائتی متعصب علمائے استشراق تھے تو دوسری طرف معتدل مصنفین تھے جو کلیسائی اثر سے آزاد تھے۔

اپنی سرگرمیوں کو منظم و مرتب کرنے کے لئے مستشرقین نے متعدد تحقیقی ادارے قائم کیئے مثلاً سوسائٹی ایشیاٹک آف پیرس (۱۸۲۳ء)، رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹین آئر لینڈ (۱۸۲۳ء) اور امریکن اورینٹل سوسائٹی (۱۸۴۲ء) وغیرہ، یہ ادارے اپنے تحقیقی جرائد بھی نکالنے لگے۔ اسی دور میں مستشرقین کی پہلی عالمی کانگریس ۱۸۷۳ء میں منعقد ہوئی اور یہ روایت بعد میں بھی قائم رہی۔ (۱۶)

جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا جب ہندوستان برطانوی نوآبادی بن گیا تو اس استشراقی تحریک کا براہِ راست ہدف بن گیا جو سولہویں صدی عیسوی سے بہت منظم طور پر آگے بڑھ رہی تھی۔

عہد جدید کا سیاسی و علمی منظر نامہ:

جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا گیا کہ عہد جدید یعنی انیسویں اور بیسویں صدی کے حوالے سے عالم اسلام کا سیاسی منظر نامہ یہ ترتیب پاتا ہے کہ یورپی استعماریت کے نتیجے میں مسلمانوں کے سیاسی زوال کا عمل مکمل ہو چکا تھا۔ جہاں تک جنوبی ایشیا کا تعلق ہے انگریزوں کے ہندوستان پر قبضے کے بعد اسلام اور بانی اسلام پر تین اطراف سے حملے ہوئے۔ پہلا حملہ عیسائی مشنریوں نے کیا جو اپنے ہم مذہب حکمرانوں کے زیر سایہ تبلیغی سرگرمیوں میں مشغول ہوئے۔ دوسرا حملہ ہندوؤں کی آریہ سماج تحریک کی طرف سے ہوا جس نے مسلمانوں کی سات سو سالہ غلامی کا بدلہ چکانے کے لئے ان کے پیغمبر اور دین کو نشانہ بنایا اور تیسرا حملہ یورپی علوم کی شکل میں ہوا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کہتے ہیں......''اسلام کو ہندوؤں کی مذہبی یلغاروں سے کچھ زیادہ خطرہ نہ تھا، اسی طرح شائد عیسائیوں کی تبلیغی سرگرمیوں سے بھی عموماً مسلمانوں پر کچھ اثر نہ پڑتا تھا مگر اسلام کے لئے سب سے زیادہ خطرناک آزمائش وہ تھی جو انیسویں صدی میں یورپ کے علمی افکار کی صورت میں ہندوستان پر نازل ہوئی۔ یہ علمی افکار وہ تھے جن سے مذہب، یورپ میں اس سے قبل نیم جان ہو کر دم توڑ رہا تھا۔ یورپ میں علوم اجتماعی کی ترقی کے ساتھ ساتھ جن کی بنیاد عقلِ محض کے علاوہ سائنس کے تجربات و مشاہدات پر رکھی گئی تھی، مذہب کی الہامی بنیادوں پر شدید حملے ہوئے اور عیسائیت کو عقل اور منطق کی کسوٹی پر پرکھا جانے لگا۔ ہندوستان میں ان مغربی افکار کی اشاعت سے اسلام کو حقیقی خطرات سے دوچار ہونا پڑا۔'' (۱۷)

بات یہ ہے کہ مستشرقین کی ایک مجبوری رہی ہے وہ اسلام کے الوہی معاملات، وحی، نبوت و رسالت اور معجزات وغیرہ سے تمدناً انکاری ہیں لہٰذا وہ بہت سی ایسی باتوں کا ادراک ہی نہیں کر سکتے جن کا ادراک ایک مسلمان مورخ با آسانی کر لیتا ہے مثلاً منٹگمری واٹ جب اپنی کتاب "What is Islam" میں رسول اللہ کا جائزہ بطور ایک قائد کے لیتا ہے تو وہ رسول اللہ کو ان کے منصب نبوت سے ہٹا کر ایک عام قائد کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ کی فوجی یا سیاسی قیادت ان کے منصب نبوت کے ساتھ وابستہ ہونے کی وجہ سے مختلف نتائج کی حامل تھی۔

بہر حال اس استشراقی مبارزت طلبی کے جواب میں ہندوستانی علماء کا جو رّدِعمل سامنے آیا، اس نے ہندوستانی روایت پسند اور جدّت پسند علماء کی تفریق واضح کر دی۔ جدّت پسند (Modrenist) گروہ مغربی تہذیب وترقی کا مدّاح تھا ان کے نزدیک اہل مغرب کی ہر بات قابلِ تقلید اور مثالی تھی اور اپنی تاریخ سے لے کر تہذیب تک ہر چیز قابلِ مذمت۔ یہ طبقہ سرسید احمد خان کی فکر سے قریب تھا۔ اس جدید مکتبۂ فکر کے اولین معماروں میں سرسید احمد خان (1817-1898) کا نام سرِ فہرست ہے۔ وہ علی گڑھ تحریک جو 1869 میں یورپ سے واپس لوٹنے پر انہوں نے چلائی، اس کی روح وہ یورپ ہی سے ساتھ لائے تھے یہ سید محمد اسلم صاحب کا تجزیہ ہے جو انہوں نے اپنے اہم مطالعہ Muslim response to the west (۱۸) میں پیش کیا ہے جبکہ سعید احمد اکبر آبادی اس فکر کو ''سرسید کی آخری عمر کی پالیسی'' قرار دیتے ہیں ''جو مسٹر بیک، پرنسپل مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے زیر اثر تھی۔'' (۱۹)
بہر حال سرسید کی اس فکر سے متاثر انگریزی تعلیم یافتہ جدت پسندوں کے اس گروہ کے بارے میں شاہ معین الدین احمد ندوی کہتے ہیں'' ......اسی طبقہ کے فضلاء میں سرسید احمد خان اور مولوی چراغ علی وغیرہ نے اپنی بساط کے مطابق مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں مضامین اور کتابیں لکھیں مگر یہ لوگ دینی علوم کے ماہر نہ تھے اور نہ صحیح دینی بصیرت رکھتے تھے اس کے علاوہ وہ مغربی علوم اور مغربی تہذیب سے اس قدر مرعوب تھے کہ ہر چیز میں اسی کو ردّ و قبول کا معیار سمجھتے تھے، اس لیئے حسنِ نیت کے باوجود انہوں نے بھی وہی غلطی کی جو اسلام کی ابتدائی صدیوں میں یونانی فلسفہ کے اعتراضات کے جواب میں متکلمین، فلاسفہ، معتزلہ اور باطنی کر چکے تھے یعنی معترضین کے تمام اعتراضات کو صحیح مان کر ان کے جوابات دینے کی کوشش کی، گو ان کے بعض جوابات محققانہ بھی تھے لیکن جن اعتراضات کا جواب نہ بن پڑا ان میں خود اسلامی عقائد وتعلیمات میں ایسی تاویلیں کیں جن کو حقیقت سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ (۲۰)

اس کے برعکس دوسرا گروہ روایت پسندوں (Traditionalist) یا قدامت پسند (Conservative)

علماء کا تھا۔ یہ انگریزوں کو مسلمانوں کا سب بڑا دشمن اور انگریزی تہذیب کو ہندوستانیوں کے حق میں سمِ قاتل خیال کرتا تھا جو انگریزی تعلیم کو ارتداد کے مترادف سمجھتا تھا اور انگریزوں کی لائی ہوئی ایجادات اور ترقی کا منکر اور اس حد تک بیزار تھا کہ ٹائپ کے حروف اور پائپ کے پانی کو بھی شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا (۲۱)

ان علماء کی علمی کوششوں اور تحریری و تصنیفی سرگرمیوں کا دائرہ چند فروعی اور جزئیاتی مسائل یا متون درسیہ کے شرح وحواشی تک محدود تھا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ تعلیم یافتہ طبقہ کو ان سے نہ کوئی دلچسپی تھی اور نہ اس کی نگاہ میں ان مسائل ومباحث کی کوئی اہمیت تھی۔ مغربی علوم وفنون اور انگریزی تعلیم نے اسلامی مسائل سے متعلق طریق فکر و بحث میں جو تبدیلی پیدا کر دی تھی، ان علماء کو نہ اس تبدیلی کا احساس تھا، نہ اس تبدیلی کے اسباب سے ان کو واقفیت تھی اور نہ ان کی زبان وقلم وقت کے جدید طرزِ سخن سے آشنا تھی (۲۲) اس گروہ کی اکثریت پرانی 'بے روح' مدرسی تعلیم، فقہی جزئیات کی ردّ وقدح اور فروعی مسائل میں مناظروں میں مصروف تھی۔ ان دنوں گروہوں کا طرزِ عمل اور دائرہ عمل ایک دوسرے سے الگ بلکہ ایک دوسرے کیلئے حریفانہ تھا۔

یہ وہ منظر نامہ تھا جس میں سید سلیمان ندوی (۲۳) کی علمی وتحقیقی زندگی پروان چڑھتی ہے۔ سلیمان ندوی کے استاد علامہ شبلی نعمانی (۲۴) (۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء) کا تعلق ہے ان میں ان یورپی فضلاء اور مستشرقین کے علمی حملوں کے مقابلے کی صلاحیت بڑی حد تک موجود تھی۔ وہ اسلامی علوم کے بھی ماہر تھے اور اسلامی تاریخ پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ نئے خیالات ورجحانات اور مستشرقین کے اعتراضات سے بھی ان کو بڑی حد تک آگاہی تھی ان کے زمانے میں جن اعتراضات کا شہرہ تھا ان کے نہایت محققانہ اور عالمانہ جوابات دیئے۔ الجزیہ، کتب خانہء اسکندریہ، اورنگ زیب عالمگیر اور الانتقاد علی التمدن اسلامی، وغیرہ اس سلسلہ کے معرکتہ الآراء مضامین ہیں (۲۵) اس سلسلہ میں ان کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ متفرق اعتراضات کے جواب کے ساتھ انہوں نے مذہبِ اسلام، اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب کو ایسے محققانہ انداز میں پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا جس میں اعتراض کی گنجائش باقی نہ رہے۔ یوں ایک نیا علم کلام پیدا ہوا جس کی بنیاد پرانے فلسفہ اور منطق کے بجائے عقل و درایت اور تنقید وتاریخ پر ہے اور اس سلسلہ کی سب سے اہم کتاب سیرۃ النبی ہے (۲۶)

سید سلیمان ندوی کی سیرت نگاری:

جہاں تک سید سلیمان ندوی کی سیرت نگاری کا تعلق ہے، اس حوالے سے ان کی چار تصانیف ہیں۔

۱۔ تاریخ ارض القران

۲۔ خطباتِ مدراس

۳۔ رحمتِ عالم
۴۔ سیرۃ النبی (آخری پانچ جلدیں)

ان میں رحمتِ عالم تو بچوں کے لئے لکھی جانے والی رسول اللہ کی سیرت ہے جو انہوں نے دارالعلوم ندوہ میں چھوٹے بچوں کے دارالاقامہ (ہوسٹل) کی تعمیر کے لئے چھپوائی تھی۔(۲۷) دیگر تین کتابوں کے مختصر جائزہ کے بعد سید صاحب کی سیرت نگاری کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جا سکے گا۔

تاریخ ارض القران:

تاریخ ارض القران جو تحقیق کے جدید اصولوں کے مطابق لکھی جانے والی جغرافیۂ عرب یا جغرافیۂ قران کی انتہائی معرکۃ الارا کتاب ہے درحقیقت سیرۃ النبی کے مقدمہ کے طور لکھی گئی تھی۔ طویل ہو جانے کی وجہ سے بعد میں اُسے مستقل کتاب کی شکل دے دی گئی اور اس کا خلاصہ سیرۃ النبی میں لے لیا گیا(۲۸) یہ دراصل قرانِ مجید کی تاریخی جغرافیائی تفسیر ہے، قران مجید میں جن مقامات اور اقوام و قبائل کا ذکر آیا ہے ارض القران میں اس کی تاریخی، جغرافیائی اور اثری تحقیق کی گئی ہے جس سے کلامِ مجید کے بیانات اور تاریخی و جغرافیائی تحقیقات میں مطابقت پیدا ہو جاتی ہے اور عرب کی قدیم تاریخ کی تحقیق میں مستشرقین نے جو غلطیاں کی ہیں ان کو بھی واضح کیا گیا ہے۔(۲۹) مثلاً بعض مغربی مصنفین جن میں سب سے نمایاں نام ولیم میور (۳۰) (۱۸۱۹ء۔۱۹۰۵ء) کا ہے، اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ رسول اللہ کا تعلق حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ہے۔ اسی طرح سے ڈی۔ایس۔ مارگولیتھ(۳۱) نے ان تمام حقائق کا بلا دلیل انکار کیا جو رسول اللہ کے نسب اور خاندان کے حوالے سے ایک مسلمہ تاریخی واقعہ کے طور پر جانے جاتے تھے۔

عموماً تاریخ ارض القران کو سید صاحب کی تاریخی تصانیف میں جگہ دی جاتی ہے،(۳۲) لیکن تاریخ کے ساتھ ساتھ یہ سیرت کی کتاب ان معنوں میں ہے کہ رسول اللہ جس علاقے، جس قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے ان سب کا تذکرہ بھی اس میں شامل ہے۔ سید سلیمان ندوی کا یہ دعویٰ بجا ہے کہ گذشتہ تیرہ سو برسوں میں ایک کتاب بھی مخصوص اس فن پر نہیں لکھی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف خود مسلمانوں کو ان حالات سے ناواقفیت رہی اور دوسری طرف غیروں کو انہیں افسانہ (Legend) کہنے کی جرأت ہوئی۔(۳۳)

ڈاکٹر محمود احمد غازی نے 'محاضراتِ سیرت' میں جغرافیۂ سیرت کے تحت یہ لکھا کہ اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب تیسری صدی ہجری کے اواخر یا چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں ابن حائک الھمدانی نے ''صفۃ جزیرۃ العرب'' کے نام سے لکھی جو ۱۸۱۹ء میں لائیڈن سے شائع ہوئی، ایک اور کتاب 'معجم ما استعجم' ہے جو پانچویں صدی

ہجری میں لکھی گئی۔ابن فقیہ الھمدانی (ف ۲۹۰ھ) کی 'کتاب البلدان' ، الاصطخری (ف ۳۴۰ھ) کی 'المسالک و الممالک'ابن الحوقل (۳۶۲ھ) کی کتاب المسالک والممالک ، بشاری (۳۷۵ھ) کی 'احسن تقاسیم فی معرفۃ الاقالیم' اورابوالفداء کی 'تقویم البلدان' اور یاقوت حموی کی 'معجم البلدان' کا بھی وہ جغرافیۂ سیرت کے حوالے سے ذکر کرتے ہیں(۳۴)غازی صاحب کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں سید صاحب کے اس دعویٰ کی قبولیت میں تردّد ہے کہ تاریخ ارض القران اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔انہوں نے جن کتب کے حوالے دیئے ان کتابوں کا تذکرہ خودسید صاحب نے ارض القران کے مقدمہ میں شرح وبسط کے ساتھ کیا ہے اور ان تاریخی کتب سے اپنی کتاب ارض القران میں بھرپور استفادہ بھی کیا ہے۔(۳۵)

لیکن تاریخ ارض القران دوحوالوں سے درج بالا کتب ہائے جغرافیۂ سیرت سے مختلف ہے۔اولاً اس کتاب کی تالیف کا مقصد اوراس کی غرض وغائت عرب کی قدیم تاریخ وجغرافیہ کی تحقیق اور قران مجید کے تاریخی اور جغرافیائی بیانات کے سلسلہ میں مستشرقین کے اعتراضات کی تردید وتصحیح ہے۔''دراصل جب مستشرقین نے عربوں کی تاریخ پر تحقیقات شروع کیں تو انہوں نے قدیم یونانی ، رومی مورخین اور جغرافیہ نویسوں کے بیانات اور جدید اثری اکتشافات اور پرانے کتبات وغیرہ سے ایسی معلومات حاصل کیں جو عربوں کی قدیم روایات کے خلاف تھیں۔کلام مجید میں عبرت وبصیریت کے لئے عرب کی قدیم قوموں ،اُن کے انبیاء ورسُل اور اُن کے اماکن وآبادیوں کا ذکر کیا گیا ہے،جس کے بعض بیانات مستشرقین کی تحقیقات سے مطابقت نہیں رکھتے ،اس پر مستزاد یہ ہوا کہ بے احتیاط مفسرین نے ان بیانات کی تفسیر میں عربوں کی بہت سی زبانی روایات اور اسرائیلیات نقل کردیں،اس سے مستشرقین کواور بھی اعتراض کا موقع مل گیا جس سے اُن کے نزدیک قرآن مجید کی صداقت مشتبہ ہوجاتی تھی،ارض القرآن ان اعتراضات کے جوابات اورعرب کی قدیم تاریخ کی تحقیق میں لکھی گئی ہے۔اس کا طرز مناظرانہ کے بجائے تحقیقی و تنقیدی ہے،اس میں قدیم وجدید دونوں ماخذوں سے قدیم عرب کی محققانہ تاریخ اوراس کا جغرافیہ پیش کیا گیا ہے، کلام مجید کے بیان کردہ واقعات پر مستشرقین کے اعتراضات کی تنقید وتردید کا خصوصیت سے لحاظ رکھا گیا ہے،جس سے دونوں میں مطابقت پیدا ہوجاتی ہے،یا مستشرقین کی تحقیقات کی غلطی اور کلام مجید کے بیان کی صداقت ظاہر ہوجاتی ہے۔اگر چہ مصنف کی ابتدائی تصنیف ہے مگر علم ونظر کی وسعت اور تحقیق وتنقید کے لحاظ سے دورِ کمال کی تصانیف سے کم نہیں ہے''(۳۶)اس کا مقدمہ خاصہ کی چیز ہے۔

ثانیاً:اس کی دوسری خصوصیت جواس کتاب کواپنے موضوع کی پہلی کتاب بناتی ہے۔وہ اس کے ماخذ ہیں جن کی بنیاد پر یہ ٹھوس علمی تحقیق سامنے آئی ہے۔یہ وہ ماخذ ہیں جوعصرِ جدید کے ذرائع ہیں ،جن متقدمین کا تذکرہ

ڈاکٹر غازی نے کیا ہے انہیں یہ تمام تر ماخذ دستیاب نہیں تھے۔ ارض القران کے لئے سید صاحب نے چار بنیادی ماخذ کو سامنے رکھا ہے۔

۱۔ ادبیاتِ اسلامیہ (Mohammadan Literature)

۲۔ ادبیات اسرائیلیہ (Jewish Literature)

۳۔ ادبیاتِ یونانیہ ورومانیہ (Greek & Roman Literature)

۴۔ اکتشافاتِ اثریہ (Archeological discoveries) (۳۷)

عرب مورخین کو قدیم یونانی اور رومی تاریخوں نیز اثری انکشافات سے فائدہ اٹھانے کا موقع کم ملا تھا۔ پھر یہ کتاب انتہائی جدید اصولِ نقد کے مطابق لکھی گئی ہے سابقہ کتابیں معلومات تو ضرور دیتی ہیں لیکن اس منہج (Methodology) پر نہیں ہیں جو عصرِ جدید کا خاصہ ہے، یہ خصوصیات بجا طور پر تاریخ ارض القران کو اپنے موضوع کی پہلی کتاب بنا دیتی ہیں۔

خطباتِ مدراس:

اکتوبر، نومبر ۱۹۲۵ء میں جنوبی ہند کی مسلم ایجوکیشن ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام سید سلیمان ندوی نے سیرت طیبہ کے موضوع پر آٹھ خطبات دیئے، جو خطباتِ مدراس کے عنوان سے کتابی شکل میں ہندوستان اور پاکستان سے بار بار شائع ہوئے۔ یہ خطبات ادب سیرت میں ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ پہلے خطبہ میں انہوں نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ انسانیت اپنی تکمیل کے لئے انبیاء علیہم السلام کی سیرت کی محتاج ہے۔ انسانیت کے اخلاق، روحانیت، دینی، دنیاوی اور فکری ضروریات ان سب کی تکمیل انبیاء کی سیرت ہی سے ہوسکتی ہے۔ دوسرے خطبے میں انہوں نے ثابت کیا کہ عالمگیر اور دائمی نمونۂ عمل صرف حضرت محمدؐ کی سیرت ہے۔ آئندہ خطبات میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ دائمی اور عالمگیر نمونہ وہی ہوسکتا ہے جو تاریخی طور پر ثابت اور محفوظ ہو، کامل، جامع اور عملی ہو، محض نظری اور غیر عملی نہ ہو۔ پھر انہوں نے یہ ثابت کیا کہ ان ساری صفات کے جامع صرف رسول اللہؐ تھے۔ اس کے بعد انہوں نے پیغام محمدی کے بارے میں بتایا (۳۸) یوں بڑے ہی جدید اور سائنٹفک انداز میں انہوں نے رسول اللہ کی کاملیت، جامعیت اور عملیت کو ثابت کیا۔

ان خطبات کا انداز عام ذاکروں اور واعظوں کے انداز جیسا عوامی نہیں بلکہ باوقار، سنجیدہ اور محققانہ ہے، ہر بات روایت و درایت کی کسوٹی پر پورا اترنے والی ہے۔ قران احادیث صحیحہ اور مستند تاریخی کتب کی بنیاد پر دیئے جانے والے یہ خطبے رسول اللہ کی سیرت کو بالکل اچھوتے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان خطبات میں انہوں نے

قارئین سیرت کو ایک نئی دنیا سے روشناس کرایا ہے اور سیرتی ادب میں پہلی بار نبیٔ اکرم کی سیرت کے امتیازی پہلوؤں کو سائنٹیفک اسلوب میں اور انتہائی بنیادی ماخذ کی مدد سے پیش کیا۔ اس کتاب میں سید سلیمان ندوی نے سیرت طیبہ کے عملی پہلو کو زیادہ اہمیت دی ہے یہ نکتہ ماقبل کے سیرت نگاروں کے ہاں عنقا ہے۔

سیرۃ النبی:

عہد جدید میں سیرت کے حوالے سے ایک رُجحان ساز کتاب شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کی ''سیرۃ النبی'' ہے جو پہلے چھ ضخیم جلدوں میں تھی، اب ساتویں مختصر جلد بھی مرتب ہوگئی ہے۔ پہلی دو جلدیں مولانا شبلی نعمانی کے قلم سے ہیں باقی پانچ جلدیں سید سلیمان ندوی نے تحریر کیں۔(۳۹)

پہلی دو جلدیں تو رسول اللہ کی حیات پر محتوی ہیں، البتہ آخری پانچ جلدیں رسول اللہ کی لائی ہوئی شریعت کا بیان ہیں۔ تیسری جلد معجزات پر ہے۔ چوتھی جلد منصب نبوت اور عقائد پر ہے۔ پانچویں جلد عباداتِ بدنی وقلبی پر، چھٹی جلد اسلام کے فلسفۂ اخلاق، اخلاقیات وآداب پر اور ساتویں جلد معاملات اور عہد نبوی کے نظم مملکت پر ہے۔(۴۰)

سیرۃ النبی عہد جدید میں سیرت کی ان نمائندہ کتب میں شامل ہے جس میں صاحبِ شریعت کے ساتھ ساتھ اس کی شریعت پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور سیرۃ کے دائرہ کو وسیع سے وسیع تر کیا ہے۔''(اس کتاب میں) آنحضرت کے واقعات زندگی کے ساتھ اس دین کو بھی پیش کیا گیا ہے جسے آنحضور کی زندگی کا سب سے بڑا واقعہ اور جسے قران مجید کی سب سے بڑی عملی تفسیر سمجھنا چاہیئے۔'' (۴۱)۔ سیرت کے اس پھیلاؤ پر بعض لوگوں کے اعتراض کے جواب میں سید سلیمان ندوی نے واضح کیا کہ ''(سیرت کے) اس سلسلہ کا تعلق صرف مغازی وسیر کے واقعات سے نہیں جن کو عام طور پر سیرت کہتے ہیں۔ بلکہ اسلام کے پیغام اور اسلام کے پیغام لانے والے (یعنی پیغمبر) دونوں سے یکساں ہے۔ صاف لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ اس سلسلہ کا مطلب ان دو سوالوں کا جواب ہے کہ اسلام کا پیغمبر کون تھا؟ اور وہ کیا لایا تھا؟ سیرت کی شروع کی تین جلدیں پہلے سوال کا جواب ہیں اور باقی جلدیں دوسرے سوال کا جواب ہیں۔'' (۴۲)۔ اس سے پہلے کی کتب سیرت چونکہ اس تازہ زاویۂ نظر سے مختلف تھیں لہٰذا سید صاحب کو بجا طور پر ''رجحان ساز'' سیرت نگار کہا جاسکتا ہے۔

سیرۃ النبی کی تالیف سے پہلے اردو میں سیرت پر جو کتب لکھی گئیں باستثنائے چند کے ان میں روایات کی صحت اور تحقیق وتنقید کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا اور وہ ہر قسم کی رطب ویابس روایات کا مجموعہ ہیں۔ اس اعتبار سے اردو میں یہ پہلی سیرت ہے ''جس میں واقعات کی تعیین سیرت کی تمام قدیم ادبیات کی چھان بین کے بعد، درایت کے جدید اصولوں کے مطابق ہوئی ہے۔ مصنف نے قدیم اور جدید دونوں سے استفادہ کیا ہے۔'' (۴۳) اس کے انداز

تحقیق و تطبیق میں مغرب کے جدید استقرائی اصولوں سے کام لیا گیا ہے اور ایک نئے علم درایت یا ایک نئے علم الکلام کا آغاز کیا گیا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی دونوں بنیادی طور پر مورخ اور متکلم تھے۔ ندوی کا یہ وصف اضافی تھا کہ وہ مورخ اور متکلم ہونے کے ساتھ ساتھ علم تفسیر اور علمِ حدیث کے بہت بڑے فاضل بھی تھے۔ فن درایت سے سیرت نگاری کا کام لینے کی جو روایت سر سید احمد خان نے ڈالی تھی اسے شبلی نے آگے بڑھایا لیکن سید سلیمان ندوی نے اسے کمال پر پہنچایا۔

عصر جدید کی سیرت نگاری کا سب سے اہم پہلو مستشرقین کے اُٹھائے گئے اعتراضات اور سوالات کا معاملہ تھا۔ اس کے ردعمل میں دو طرح کے رویے سامنے آئے۔ ایک تو وہ مدافعانہ رویہ تھا جس نے مورخین کو بہت سی باتوں کی تاویل پر مجبور کر دیا، اس رویہ کا اظہار ہندوستان میں سر سید احمد خان اور مصر میں محمد حسین ہیکل سمیت بعض مورخین اور سیرت نگاروں نے کیا۔ اس میں شک نہیں کہ محمد حسین ہیکل نے مستشرقین کو سخت اور نپا تُلا جواب دیا لیکن بعض معاملات میں مثلاً معجزے کی بحث میں وہ دفاعی ہوتے نظر آتے ہیں (۴۴) ان حضرات نے سیرت کے بعض مباحث کے سلسلہ میں جمہور مورخین سے ہٹ کر رویہ اختیار کیا ہے۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا مسلک جمہور سے انحراف کوئی کمزوری ہے یا اسے محض ایک علمی رویہ سمجھا جائے؟

دوسری طرف وہ پُر اعتماد اور پختہ رویہ تھا جس نے مورخین کو اپنی تاریخ کے سابقہ نتائج کے نئے تجزیات پر آمادہ کیا اس کی مثال سید سلیمان ندوی ہیں جبکہ شبلی نعمانی کو ہم دونوں رویوں کے بین بین دیکھتے ہیں۔ ندوی کی سیرۃ النبی میں مستشرقین کے اعتراضات کا بھرپور جواب دیا گیا ہے۔ سید عبداللہ کہتے ہیں۔ ''اس میں مغربی سوانح نگاروں کے پھیلائے ہوئے وساوس اور مغالطوں پر نقد و جرح کر کے ان کے نام نہاد عقلی طریقِ کار کے پرخچے اُڑائے گئے ہیں''۔ (۴۵) مغربی سوانح نگاروں کی مدلل تردید و تنقید کے حوالے سے ندوی اپنے استاد شبلی سے آگے نظر آتے ہیں۔ سیرۃ النبی کی آخری پانچ جلدوں میں اعتذار کا لہجہ شبلی کی تحریر کردہ دونوں جلدوں کے مقابلے میں بہت کم ہے اور تعبیر و توجیہہ میں جس جرأت مندی کا اظہار کیا گیا ہے وہ سلیمان ندوی ہی کا حصّہ ہے۔

علامہ شبلی نے مستشرقین کے اعتراضات سے دب کر رسول اللہ کے غزوات' غلامی اور تعدد ازواج کے مسئلہ پر جو معذرت خواہانہ رویہ اپنایا ہے، اس کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا جب سید سلیمان ندوی معجزات پر لکھتے ہیں۔ شبلی کے اس رویہ پر حکیم عبدالروف دانا پوری لکھتے ہیں۔ ''......خصوصاً غزوۂ بدر کے حالات میں تو انھوں (شبلی) نے عجیب و غریب جدت کی ہے۔ تمام واقعات کو پلٹ دیا ہے۔ تمام روایات صحیحہ کو ترک کر دیا ہے۔ قران پاک سے غزوہ کے

حالات کو مرتب کرنے کا دعویٰ کیا ہے اور قران پاک کے مطالب ایسے لئے ہیں اور اس سے وہ باتیں پیدا کی ہیں جو اب تک کسی نے نہ کی تھیں، مولانا کی نیت خراب نہ تھی۔ واقعات میں الٹ پھیر اور مطالب میں ردو بدل انہوں نے اس لئے کیا کہ عیسائیوں کو جواب دیا جائے اور بتایا جائے کہ غزوۂ بدر اس لیئے نہیں ہوا تھا کہ رسول اللہ قریش کے قافلۂ تجارت پر حملہ کرنے کی نیت سے نکلے تھے بلکہ اس لئے ہوا کہ خود قریش مدینہ پر حملہ کرنے آئے تھے۔" (۴۶)

مستشرقین کو جواب دینے کا آغاز سرسید احمد خان نے 'خطباتِ احمدیہ' سے کیا تھا یہ کتاب سیرت نگاری کے حوالے سے اہم رجحان کی آئنہ دار تھی تاہم اس میں کمزوری یہ تھی کہ مستشرقین کے اعتراضات کے دباو میں آکر سرسید نے معجزات کا انکار کیا ہے یا دور از کار قسم کی تاویلات کی ہیں اور اس سلسلے میں صحیح احادیث کے انکار سے بھی پس و پیش نہیں کیا۔ اس سے قدرے کم معذرت خواہانہ رویہ محمد حسین ہیکل کا ہے جو صرف قران کو معجزہ مانتے ہیں اس کے علاوہ معجزات کے قائل نہیں (۴۷)۔ ان دونوں کے مقابلے میں سید سلیمان ندوی نے نہایت عالمانہ اور متکلمانہ انداز اختیار کیا ہے جس میں مرعوبیت نام کو نہیں۔ یہ نا سمجھا جائے کہ اس طرح شبلی نعمانی یا محمد حسین ہیکل کی تنقیص مقصود ہے، حق تو یہ ہے کہ اول الذکر نے 'سیرت النبی' کے مقدمے میں اور آخر الذکر میں 'حیاتِ محمدؐ' کے مقدمے میں مستشرقین کے تعصبات کے حوالے سے بڑی عالمانہ تنقید کی ہے اور ان کے اصول کار کی غلطیاں واضح کی ہیں اور سیرت نگاری کے صحیح اصولوں کی نشاندہی کر کے سیرت نگاری کے معیاری نمونے پیش کئے ہیں۔

ماخذ:

سید سلیمان ندوی کی سیرت نگاری کا ایک اور اہم وصف ان کے ماخذ ہیں ۔قدیم سیرت کے ماخذ کے بارے میں سرسید احمد خان نے ایک نیا رویہ اختیار کیا تھا جس کی بعد میں تقریباً ہر سیرت نگار نے پیروی کی وہ یہ کہ تمام دستیاب ماخذ کا ناقدانہ جائزہ لے کر یہ طے کیا جائے کہ کون سے ماخذ قابلِ اعتماد ہیں اور کون سے ناقابلِ اعتماد۔ چنانچہ ولیم میور کی کتاب کے جواب میں لکھی جانے والی خطبات احمدیہ کا ایک پورا خطبہ ہی انہوں نے مصادر سیرت پر لکھا تھا۔ ان کے اس طریقے کو بعد کے سیرت نگاروں نے اپنایا اور ہر بڑے سیرت نگار نے سیرت کے ماخذ کا ناقدانہ جائزہ لیا۔ شبلی نعمانی جو کافی عرصے تک سرسید کے ساتھ علی گڑھ میں رہے، وہ بھی اس جدید طریقے سے متاثر ہوئے اور سیرۃ النبی کے مقدمہ میں انہوں نے جس طرح ماخذ کی بحث کی ہے، اس میں وہ سرسید سے آگے نظر آتے ہیں۔

سلیمان ندوی خود کہتے تھے" میں نے سیرت کی تالیف اور اسلامی مسائل میں کتاب و سنت کے علاوہ کسی تیسری چیز کو بنیاد نہیں بنایا ہے۔" (۴۸)۔ سید سلیمان ندوی کی سیرت نگاری کا یہ اصول کہ 'حدیث' کو بنیادی ماخذ کے

طور پر استعمال کیا جائے ، اپنے عہد کے تناظر میں بہت اہم ہے کیونکہ اس وقت مستشرقین اور ان کی پیروی میں بعض مسلمان مورخین حدیث کو مشکوک بنا چکے تھے اور اسے درجہ استناد سے گرا چکے تھے۔ سید صاحب نے اصول درایت سے کام لے کر ایک طرف حدیث کی حجیت کو قائم کیا تو دوسری طرف سیرت نبوی کے سرمایہ کو ضعیف روایتوں کی آلائش سے کس طرح پاک کیا ہے اس کا اندازہ سب سے زیادہ معجزات کی بحث میں ہوتا ہے۔ معجزاتِ نبوی کے سلسلہ میں مسلمانوں نے یا تو افراط سے کام لیا اور معجزات کا انکار کر بیٹھے یا تفریط سے کام لیا اور ہزاروں بے سروپا روایتوں کو جزو ایمان بنا بیٹھے۔ سید صاحب نے ایک طرف تو اپنے کلام و دلائل سے معجزات کا انکار کرنے والوں کے شکوک وشبہات کا ازالہ کیا ، دوسری طرف قران اور روایاتِ صحیحہ کی بنیاد پر معجزات نبوی کا صحیح مرقع پیش کیا اور اس استدلال اور انتخاب میں انہوں نے کسی تجددّ سے کام نہیں لیا۔

الغرض ندوی صاحب نے دوبارہ حدیث کی حقانیت پر اپنی سیرت نگاری کی بنیادیں استوار کیں اس حوالے سے اگر معجزات کے ضمن میں سر سید احمد خان، محمد حسین ہیکل اور سید سلیمان ندوی کی فکر کو دیکھیں تو بڑا واضح فرق نظر آتا ہے۔ محمد حسین ہیکل اور ندوی دونوں مستشرقین کے خلاف سخت علمی رویہ رکھتے ہیں لیکن دونوں کے مابین بھی فرق نظر آتا ہے۔ ہیکل صرف قرآن کو معجزہ مانتے ہیں اور دیگر معجزات کے منکر ہیں اس حوالے سے وہ روایات بھی نہیں مانتے جب کہ ندوی خرقِ عادت کے حوالے سے روایات صحیحہ کو مانتے ہیں اور اس حوالے سے جدید علمی طریقۂ نقد اختیار کر کے اپنی بات پیش کرتے ہیں۔

اسلوب:

سید سلیمان ندوی نے سیرت نگاری کا جو اسلوب وضع کیا اس میں وہ اپنی مثال آپ تھے، گو کہ اس اسلوب کا آغاز سر سید احمد خان اور سید امیر علی سے ہو چکا تھا۔ جو زبان کے اعتبار سے سادہ، اسلوب کے اعتبار سے دلنشین، دلائل کے اعتبار سے موثر اور پیشکش کے اعتبار سے انتہائی عالمانہ اور ادیبانہ تھا۔ اسی اسلوب کو شبلی نے غیر معمولی بلندیوں پر پہنچا دیا، اس کی وجہ سے وہ قدیم اسلوب متروک ہو گیا جس پر لوگ پہلے سیرت لکھا کرتے تھے۔ جس میں زیادہ بیان معجزات کا اور ان امور کا ہوتا تھا جن کا تعلق روحانیت سیرت سے ہے، جس کا سیرت اور تاریخی واقعات سے نسبتاً کم تعلق ہوتا تھا(۴۹) دورِ جدید کے مصنفین کی طرح سید سلیمان ندوی نے مغربی اسلوبِ استدلال سے کام لیا ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں: ''باوصف اس عقیدت کے سید صاحب کی شخصیت اور ان کا ''اسلوب تحریر'' بھی شبلی سے مختلف ہے شبلی کے قلم میں بڑی رعنائی اور برنائی ہے، تخیل میں رنگینی اور جذبہ میں حرارت اور

تلملاہٹ ملتی ہے۔ جذباتی اور تخیلی فنکاروں کے یہ خاص صفات ہیں...... سید صاحب تاریخی دیانت اور امانت کا اس درجہ لحاظ کرتے تھے کہ ان کو اپنی تصانیف میں شاعری کرنے کی بہت کم فرصت یا مواقع ملتے تھے۔ وہ تحقیق اور تنقید میں جتنی احتیاط برتتے تھے اور محنت کرتے تھے اتنی ہی مطالعہ کرنے والے کے جذبات یا تخیل کو بے ضرورت مہمیز کرنے سے پرہیز کرتے تھے۔ تصانیف میں شبلی کا انداز مشرقی ہے۔ سید صاحب کا مغربی۔'' (۵۰)

الغرض سید سلیمان ندوی کی سیرت نگاری قدیم و جدید کے علی الرغم ایک نئے کلامی مکتبۂ فکر کی بنیاد ڈالتی نظر آتی ہے۔ سیرت کے حوالے سے ان کا انداز جدت پسندوں اور روائت پسندوں کے درمیان ایک مستحکم اور پختہ رویئے کے طور پر نظر آتا ہے۔ شبلی بھی اسی راہ کے مسافر تھے لیکن وہ کئی جگہ استشراق کے ہاتھوں مرعوبیت کا شکار نظر آتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی میں یہ مرعوبیت نہیں تھی انہوں نے اس ''ملعونیت کبریٰ'' (۵۱) کے خلاف ایک زیادہ معقول، اور کلامی انداز اختیار کیا۔ دونوں مکاتیبِ فکر کے علی الرغم یہ ایک زیادہ منطقی رویہ تھا جس کی بنیاد قران اور روایاتِ صحیحہ تھیں۔

اس بارے میں دو رائے نہیں ہوسکتیں کہ سید سلیمان ندوی نے سیرت نبوی کو وہ استناد عطا کیا جو ایک طرف روائتی مسلمان سیرت نگاروں اور میلاد ناموں کے مصنفین نے، تو دوسری طرف مستشرقین نے برباد کیا تھا۔ اول الذکر گروہ نے نا معقول عقیدت اور ثانی الذکر گروہ نے بے اعتدالی اور بے جا تعصب کے ہاتھوں رسول اللہ کی اصل شخصیت اور ان کے دین کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ سید سلیمان ندوی کی فکر میں جو اعتدال و توازن تھا، احتیاط و تورع، قدیم و جدید کی واقفیت تھی اس کی وجہ سے ان کی سیرت نگاری افراط و تفریط سے پاک ایک طرف تجدد اور آزاد خیالی اور دوسری طرف جمود و تنگ نظری سے پاک تھی۔ انہوں نے سیرت کے حوالے سے صدہا شبہات کا ازالہ کیا اور صدہا سوالات کے جواب فراہم کئے۔ بطور سیرت نگار ان کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے ''مفروضات کو واقعات'' بننے سے روکا۔

حواشی وحوالہ جات

(۱) ندوی، شاہ معین الدین احمد ٗحضرت الاستاذ کے دینی وعلمی خدمات ٗ مشمولہ معارف، اعظم گڑھ (سلیمان نمبر) مئی ۱۹۵۵ء ص ۱۷۴

(۲) استشراق (Orientalism) عربی مادہ ''شرق'' سے مشتق ہے۔جس کے معنی'' شرق شناسی'' کے ہیں۔اس اصطلاح کا استعمال زیادہ قدیم نہیں ہے اسی لیے قدیم عربی لغات میں استشراق کا مادہ مذکور نہیں ہے۔یہ اصطلاح دراصل انگریزی لفظ orientalism کے مفہوم کوعربی زبان میں ادا کرنے کے لئے وضع کی گئی ہے۔اس لفظ کے اصطلاحی مفہوم اور دورِ جدید میں اس کے بکثرت استعمال کے پیشِ نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اہلِ مغرب کا مشرق کے تہذیبی ورثے، تاریخ، زبان وادب، فنونِ لطیفہ اور علوم واطوار وغیرہ کا مطالعہ استشراق کہلاتا ہے اور مستشرق اس مغربی اسکالر کو کہتے ہیں جو مشرقی علوم اور السنۂ شرقیہ میں دلچسپی رکھتا ہو (محمد حسین علی الصغیر، المستشرقون والدراسات القرانیہ، بیروت ۱۹۸۳ء ص ۱۱)

(۳) سب سے پہلے جس شخص نے اسلام کے خلاف اس معاندانہ رویہ کا آغاز کیا وہ آٹھویں صدی عیسوی کا ایک پادری ٗجان ٗ(Jhon of Domascus) تھا۔اس کا زمانہ ۷۰۰ء تا ۷۵۴ء تھا ٗجان ٗ بنیادی طور پر ایک مذہبی عالم، مصنف، مشرقی کلیسا کا فارغ التحصیل راہب اور پادری تھا۔جان نے اسلام کو وثنی (Pagan) مذہب قرار دیا اور کعبہ کو بت سے تعبیر کیا۔اُس نے رسول اللہ کو بے دین، نبی کاذب کا خطاب دے کر اسلام کو ایک فاسد دین قرار دیا۔اُس نے رسول اللہ پر الزام لگایا کہ آپ نے ایک پادری کی معیت میں بائبل کو مسخ کر کے اسلام نام کا ایک نیا مذہب ایجاد کیا۔ جان وہ پہلا مسیحی مشنری تھا جس نے رسول اللہ پر جنسی الزامات کا طومار کھڑا کیا جو بعد میں مغربی اسکالرز کی تحقیق کا دلچسپ موضوع بن گیا۔ جان کی کتاب De Haere Sibus اسی قسم کے خرافات کا مجموعہ ہے، دیکھئے سید حبیب الحق ندوی ''اسلام اور مستشرقین'' مشمولہ معارف، اعظم گڑھ، شمارہ مئی ۱۹۸۳ء ص ۳۳۲۔۳۳۳

(۴) ڈاکٹر حبیب الحق ندوی کے مطابق مسلمانوں اور اسلام کو مٹانے کے لئے صلیبی جنگیں ۱۰۹۹ءتا ۱۴۶۴ء یعنی تقریباً پانچ سو سال تک جاری رہیں ان پانچ صدیوں میں وقفہ وقفہ سے یورپ کی مشترکہ عسکری قوت، مسلم شرقِ اوسط پر زندگی کے لئے موت اور آبادی کے لئے ویرانی کے دیو کی طرح منڈلاتی رہی۔صلیبی جنگوں کی پانچ سو سالہ تاریخ کے دوران مستشرقین نے اسلام کے خلاف جو لٹریچر پیدا کیا اس کے جائزہ کے لئے دیکھئے حبیب الحق ندوی، ٗاسلام اور مستشرقین ٗ مشمولہ معارف، اعظم گڑھ، مئی ۱۹۸۳ء ص ۳۳۶۔۳۳۷

(۵) محمد اسد 'The Road to Makkah' (اسلامک سروس، دہلی ۲۰۰۰ء) ص ۷

(۶) نثار احمد، ڈاکٹر 'مستشرقین اور مطالعہ سیرت' مشمولہ نقوش، رسول نمبر ص ۵۰۲

(۷) گیام پوسٹل (۱۵۱۰ء تا ۱۵۸۱ء) فرانسیسی مستشرق تھا وہ اپنے زمانے کا زبردست مسیحی عالم تھا۔ اس کا کام زیادہ تر لغت اور لسانیات کے حوالے سے ہے۔ اس کے لئے ۱۵۳۹ء میں کلیہ فرانس (College de France) قائم کیا گیا اور وہ عربی کی پہلی کرسی صدارت پر فائز ہوا۔ ایڈورڈ سعید نے لکھا ہے کہ پوسٹل کا شمار یورپی نشأۃ ثانیہ کے مستشرقین میں ہوتا ہے۔ پوسٹل اس بات کا مدعی تھا کہ وہ اپنی زبان دانی کے سبب ایشیاء سے لے کر چین کی سرحدوں تک بغیر کسی مترجم کے سفر کرسکتا ہے (دیکھئے ایڈورڈ سعید، 'Orientalism' پینگوئن بکس، انگلینڈ ۲۰۰۳ء ص ۵۱)

(۸) ڈاکٹر نثار احمد، ص ۵۰۲

(۹) ایسے مستشرقین میں ڈچ کے H.Relan کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اس کی معروف تالیف ''مذہب محمدؐ'' (De Religione Mohiommedica) ۱۷۰۵ء میں شائع ہوئی، جس میں اس نے زور دیا کہ مشرق کو اس کے اپنے مصادر و مراجع کی مدد سے سمجھنا چاہئے اس نے اعتراف کیا کہ یورپ میں اسلام کے علاوہ شائد ہی کوئی دوسرا مذہب اس قدر تمسیخ کا شکار ہوا ہو۔ اس کا کہنا ہے کہ اصل اسلام کو کماحقہ سمجھنے میں خود عیسائیت کا فائدہ ہے۔ اسی طرح (Count de Boulainvillers) ہے جس کی کتاب Vie de- Mahomet، جولندن سے ۱۷۳۰ء میں شائع ہوئی، میں پہلی بار اسلام کو ایک 'عقلی مذہب' قرار دیا اور رسول اللہ کو نبی تسلیم کیا۔ (مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے ڈاکٹر حبیب الحق ندوی کا مقالہ ''اسلام اور مستشرقین'' مشمولہ معارف، مئی ۱۹۳۸)

(۱۰) سب سے پہلے ہالینڈ نے اپنے مقبوضہ جزائر مشرق یعنی انڈونیشیا میں ۱۷۷۸ء میں ایک ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی۔ اس کی تقلید میں انگریزوں نے بمقام کلکتہ ۱۷۸۴ء میں جنرل ایشیاٹک سوسائٹی اور ۱۷۸۸ء میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔

(۱۱) ان کتابوں کی تفصیل کے لیئے دیکھئے شبلی نعمانی 'سیرۃ النبی' جلد ۱ ص ۹۱-۹۰ (مقدمہ)

(۱۲) ایضاً

(۱۳) کارلائل (Carlyle) انگلستان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی کتاب (Heroes and Hero worship) ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ ۱۸۴۶ء میں طبع ہوئی

(۱۴) حتی۔ فلپ۔ کے 'اسلام اور محمد، مغربی لٹریچر میں' (مترجم وحید الدین خان) مشمولہ ''محدث'' (رسول نمبر) حصہ دوئم ص ۳۴۲-۳۴۱

(۱۵) ہیکل محمد حسین 'حیاۃ محمد' مترجم ابو یحیٰ امام خان نوشہروی، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۳ ص ۱۵-۱۷ (مقدمہ)

(۱۶) نثار احمد، ڈاکٹر، ص ۵۰۹ تا ص ۵۱۷ (نیز اس صدی کے مستشرقین کے حالات اور کام کے لئے دیکھئے سید سلیمان ندوی کا طویل مقالہ مشمولہ ''الندوہ'' لکھنو ، مئی ۱۹۲۱)

(۱۷) عبداللہ' سید 'سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ، (مکتبہ کاروان ،لاہور ۱۹۶۰ء) ص ۲۰

(۱۸) محمد اسلم ،سید 'Muslim Response to the west' (نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ کلچرل ریسرچ ،اسلام آباد ۱۹۸۸ء) ص ۱۳

(۱۹) اکبر آبادی' سعید احمد' 'مولانا سید سلیمان ندوی میری نظر میں' مشمولہ معارف (سلیمان نمبر) اعظم گڑھ، مئی ۱۹۵۵ء ص ۱۵۸

(۲۰) ندوی ، شاہ معین الدین احمد' حضرت الاستاذ کی دینی و علمی خدمات' مشمولہ معارف اعظم گڑھ ، (سلیمان نمبر) مئی ۱۹۵۵ء ص ۱۷۶ (اسی طرح کے خیالات کا اظہار خود سید سلیمان ندوی نے کیا ہے۔ دیکھئے حیاتِ شبلی ص ۱۵)

(۲۱) افتخار بیگم' ڈاکٹر' دبستانِ شبلی کے ایک ممتاز ادیب ،سید سلیمان ندوی' مشمولہ ''سید سلیمان ندوی'' مرتبہ خلیق انجم (لاہور ۱۹۸۹ء) ص ۱۱۳

(۲۲) اکبر آبادی، سعید احمد' مولانا سید سلیمان ندوی میری نظر میں' ص ۱۵۸

(۲۳) سید سلیمان ندوی ، دیسنہ ،صوبہ بہار کے رہنے والے تھے، والد کا نام حکیم سید ابوالحسن تھا۔ ۱۲ دسمبر ۱۸۸۴ء (۱۳۰۲ھ) میں پیدا ہوئے۔ نسباً رضوی سادات ہیں۔ ۱۹۰۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل ہوئے اور ۱۹۰۸ء میں تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ندوہ ہی میں عربی ادب کے استاد مقرر ہوئے تو شبلی کی صحبت بھی نصیب ہوئی۔ شبلی نے جوہر قابل سمجھ کر سید سلیمان ندوی کی خصوصی تربیت کی اور ۱۹۰۷ء میں انہیں ماہنامہ ''الندوہ'' کا سب ایڈیٹر مقرر کیا یہیں سے سلیمان ندوی کی علمی زندگی میں نکھار آنا شروع ہوا۔ انہوں نے متعدد تحقیقی و تاریخی مضامین الندوہ کے لئے لکھے اور اہل علم کی توجہ اور داد حاصل کی۔ اسی زمانے میں علامہ شبلی نے ندوہ میں ''شعبہ تصحیح اغلاط تاریخی'' قائم کیا جس کا مقصد تاریخ کی نصابی کتابوں میں ایسے واقعات کی اصلاح و تصحیح تھی جن میں مسلمانوں کی تاریخ و تہذیب کے بارے میں انگریز مورخین کی متعصبانہ اور گمراہ کن تحریروں کو قصداً شامل کیا گیا تھا جن کو پڑھ کر مسلمان طلباء یا شرمندہ ہوتے تھے یا گمراہ ہو رہے تھے۔ علامہ شبلی نے سید صاحب کو اس شعبہ کا سیکریڑی بنایا۔ یہاں سے سید صاحب کی دلچسپی اسلامی تاریخ میں روز افزوں بڑھنے لگی۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں علامہ شبلی نے سیرۃ النبی ﷺ کی تالیف و تدوین کے عظیم الشان منصوبے کا آغاز کیا اور سید صاحب کو اپنا معاون بنایا۔ ۱۹۱۳ء میں علامہ شبلی جب ندوہ سے مستعفی ہو کر اعظم گڑھ چلے گئے تو سید صاحب بھی لکھنو کو خیر آباد کہہ کر کلکتہ چلے گئے اور 'الہلال' سے وابستہ ہو گئے تاہم تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ دکن کالج پونا میں عربی و فارسی کے پروفیسر ہو گئے۔

نومبر ۱۹۱۴ء میں جب علامہ شبلی کا وقت آخر تھا۔انہوں نے تار دے کر سید صاحب کو بلوایا اور تکمیل سیرۃ النبی ﷺ کی وصیت کی ، علامہ شبلی کی وفات (۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء) کے بعد مولانا حمید الدین فراہی اور سید صاحب نے مجلس اخوان الصفاء بنائی جس کا مقصد علامہ شبلی کے ادھورے کاموں کی تکمیل تھا۔سید صاحب دکن کالج پونا کی پروفیسری چھوڑ کر اعظم گڑھ آ گئے۔دارالمصنفین قائم کیا، ماہنامہ 'معارف' کا اجراء کیا اور سیرت النبی ﷺ کی تکمیل کی۔سید صاحب دارالمصنفین سے بتیس سال وابستہ رہے یہاں دو درجن سے زائد علمی، ادبی ، تحقیقی اور تاریخی کتب سپرد قلم کیں۔اپنے رفقاء اور علامہ شبلی کے تلامذہ کو جمع کیا۔ان کے زمانۂ نظامت میں سیکڑوں کتابیں شائع ہوئیں اس طرح سید صاحب نے اپنی مسلسل محنت اور کوششوں سے دارالمصنفین کو ہندوستان کا ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کا ایک موقر علمی و تصنیفی ادارہ بنا دیا جس نے مسلمانوں کی علمی و فکری اور سیاسی تاریخ کی تدوین کے ساتھ تاریخ نویسی کا بلند معیار بھی دنیا کے سامنے پیش کیا۔

۱۹۴۶ء میں سید صاحب نے نواب حمید اللہ خان والئ بھوپال کی دعوت پر بھوپال کے دارالقضاء اور عربی مدارس کی سربراہی قبول کی جہاں وہ چار برس تک رہے اس زمانے میں بھی دارالمصنفین اور معارف سے ان کا قلبی و علمی تعلق باقی رہا اور اس کی نظامت بھی انہیں کے ہاتھوں میں رہی۔۱۹۴۹ء میں سید صاحب پاکستان چلے آئے جہاں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی۔۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء میں ۶۹ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اور کراچی میں آسودہ خاک ہوئے۔(مقدمہ از ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر، مشمولہ' اشاریہ معارف اعظم گڑھ' صفحہ ۱۴۔۱۵، مرتبہ ڈاکٹر سہیل شفیق، قرطاس کراچی، ۲۰۰۶ء)

(۲۴) شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی مئی ۱۸۵۷ء میں اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ان کے والد شیخ حبیب اللہ اعظم گڑھ ہی میں درجہ اوّل کے وکیل تھے۔شبلی تحصیل علم سے فارغ ہو کر کچھ عرصہ سرکاری ملازمت کرنے کے بعد ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ کالج کی پروفیسری پر مامور ہوئے۔ بلادِ اسلام، ترکی، مصر اور شام کا بھی سفر کیا ہر جگہ کے کتب خانے دیکھے۔ سفر سے واپسی کے بعد شمس العلماء کا خطاب ملا۔۱۸۹۸ء میں کالج چھوڑ کر حیدر آباد پہنچے اور وہاں ناظم علوم وفنون کے عہدے پر ممتاز ہوئے۔اور چار برس تک خدمات سرانجام دیں۔۱۹۰۵ء میں جب ندوۃ العلماء قائم ہوا تو بطور سیکریٹری اسی سے وابستہ ہو گئے۔ اردو کے علاوہ عربی اور فارسی کے عالم تھے۔کسی قدر انگریزی بھی جانتے تھے۔بیس کتابیں تصنیف کیں ،جن میں سیرۃ النعمان' الفاروق' المامون' الغزالی' شعرالعجم' موازنۂ انیس و دبیر مشہور ہیں۔ان کی سب سے معرکۃ آلارا کتاب ''سیرۃ النبی'' ہے۔نومبر ۱۹۱۴ (۲۹۔ذی الحجہ ۱۳۳۲ء) اعظم گڑھ میں انتقال کیا۔(نظامی بدایونی' قاموس المشاہیر' خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، ۲۰۰۴ء جلد دوم ص ۱۳)

(۲۵) ندوی، شاہ معین الدین احمد' حضرت الاستاذ کی دینی و علمی خدمات' ص ۱۷۶

(۲۶) ایضاً ص ۱۷۷

(۲۷) ابو سلیمان شاہ جہاں پوری 'خطوطِ سلیمانی' (ادارۂ تصفیف و تحقیق پاکستان، کراچی ۱۹۹۳ء) صفحہ ۲،۳۸،۷۲

(۲۸) ندوی، شاہ معین الدین احمد 'حیات سلیمان' (دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۷۳ء) ص ۶۷

(۲۹) ایسے مقامات کے لئے دیکھئے سید سلیمان ندوی، تاریخ ارض القران، (مجلس نشریات اسلام، کراچی، تاریخ ندارد) جلد ۱ ص ۱۵، ۳۰، ۳۹، ۶۱، ۶۳ وغیرہ

(۳۰) ولیم میور (۱۸۱۹ء تا ۱۹۰۵ء) مشہور انگریز مستشرق تھا جس نے ہندوستان میں کئی سال گزارے۔ ۱۸۵۷ء میں آگرہ میں شعبہ فارسی کا سربراہ تھا۔ اس کا بھائی جان میور (۱۸۱۰ء تا ۱۸۸۲ء) بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم تھا، ولیم میور کی اہم کتاب ''دی لائف آف محمدؐ'' ہے جس کے جواب میں سرسید احمد خان نے 'خطباتِ احمدیہ' لکھی تھی۔

(۳۱) مارگولیتھ (Margolioth) کا تعلق انگلینڈ سے تھا۔ سیرت کے حوالے سے ان کی تصنیف ''محمدؐ'' ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی تھی

(۳۲) دیکھئے اعظمی، محمد الیاس کی کتاب 'علامہ سید سلیمان ندوی بہ حیثیت مورخ' (خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ) ۲۰۰۱ء ص ۴۹

(۳۳) ندوی، سید سلیمان 'ارض القران' (مجلسِ نشریاتِ اسلام۔ کراچی) تاریخ ندارد، حصہ اول ص ۱۳

(۳۴) غازی، محمود احمد 'محاضراتِ سیرت' (الفیصل، لاہور، ۲۰۰۸ء) ص ۴۔۱۰۲

(۳۵) دیکھئے تاریخ ارض القران ص ۱۸ تا ص ۲۹

(۳۶) ندوی، شاہ معین الدین 'حضرت الاستاذ کی دینی و علمی خدمات' مشمولہ معارف، (سلیمان نمبر) اعظم گڑھ، مئی ۱۹۵۵ء۔ ص ۱۹۳

(۳۷) ندوی، سید سلیمان 'تاریخ ارض القران' ص ۱۸

(۳۸) ندوی، سید سلیمان، 'خطباتِ مدراس' (طارق اکیڈمی، فیصل آباد) تاریخ ندارد

(۳۹) سیرۃ النبی کی پہلی جلد ۱۹۱۸ء میں، دوسری جلد ۱۹۲۰ء میں، تیسری جلد ۱۹۲۴ء میں، چوتھی جلد ۱۹۳۲ء میں، پانچویں جلد ۱۹۳۵ء میں، چھٹی جلد ۱۹۳۸ء میں اور ساتویں جلد ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی (ندوی، شاہ معین الدین احمد 'حیاتِ سلیمان' ص ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۹۲، ۴۳۱، ۲،۴۷۲، اعظم گڑھ،)

(۴۰) دیکھئے شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی 'سیرۃ النبی' (۷ جلدیں) دارالاشاعت کراچی طبع اول ۱۹۸۵ء

(۴۱) عبداللہ، سید 'فن سیرت نگاری پر ایک نظر' مشمولہ تعمیر افکار (سیرت نمبر) اپریل۔جون ۲۰۰۷ء ص۔۱۵

(۴۲) ندوی، سید سلیمان 'سیرۃ النبی' جلد ۵ ص ۷

(۴۳) سید عبداللہ 'فن سیرۃ نگاری پر ایک نظر' مشمولہ تعمیر افکار، ص ۱۵

(۴۴) ہیکل، محمد حسین 'حیاۃ محمدؐ' ص ۵۷ تا ص ۶۵

(۴۵) سید عبداللہ 'فن سیرت نگاری پر ایک نظر' ص ۱۵
(۴۶) داناپوری' حکیم عبدالروف 'اصح السیر' کراچی، ص ۶-۵
(۴۷) ہیکل محمد حسین 'حیاۃ محمدؐ' ص ۵۹
(۴۸) ندوی، مجیب اللہ 'تحریک ندوۃ العلماء اور سید صاحب' مشمولہ معارف (سلیمان نمبر) ص ۲۷۰
(۴۹) محاضراتِ سیرت ص ۶۳۹
(۵۰) صدیقی، رشید احمد ''گنج گرانمایہ'' مشمولہ معارف (سلیمان نمبر) اعظم گڑھ، مئی ۱۹۵۵ء ص ۱۱۶
(۵۱) شذراتِ سلیمانی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۹۰ء حصہ اول ص ۴-۱۵۳

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆